QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amir
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

تفسیر احسن الکلام میں خصائصِ نبوی ﷺ: تفسیری منہج، امتیازات اور معاصر معنویت کا تجزیاتی مطالعہ

Prophetic Characteristics in Tafsīr Aḥsan al-Kalām: An Analytical Study of Exegetical Methodology, Distinctive Features, and Contemporary Relevance

Khansa Arshad
MPhil Scholar, DIS, Riphah International University, Faisalabad.
Email: khansaarshad2611@gmail.com
Dr. Faizan Hassan Javed
Assistant Professor, DIS, Riphah International University, Faisalabad. Email: engr.faizan@riphahfsd.edu.pk

Abstract

The Qur'an presents the personality and mission of the Prophet Muhammad ﷺ through various dimensions, including his distinctive characteristics, virtues, responsibilities, and special privileges granted to him by Allah Almighty. The study of these Prophetic characteristics, known as Khaṣāʾiṣ al-Nabawiyyah, is significant for understanding the unique status of the Prophet ﷺ within the Qur'anic conception of prophethood. This research examines the treatment of Khaṣāʾiṣ al-Nabawiyyah in Tafsīr Aḥsan al-Kalām, with particular focus on its exegetical methodology, distinctive interpretive features, and contemporary relevance.

The study employs a qualitative and analytical methodology. Relevant Qur'anic verses concerning the distinctive characteristics, privileges, responsibilities, and attributes of the Prophet ﷺ are identified and analyzed in the light of Tafsīr Aḥsan al-Kalām. Particular attention is given to the exegetical sources, use of Prophetic traditions, explanations of Qur'anic context, linguistic interpretation, and the manner in which the exegete establishes the distinctive status of the Prophet ﷺ. The study also explores how these interpretations contribute to a balanced understanding of Prophetic authority, obedience, reverence, and ethical conduct.

The research demonstrates that Tafsīr Aḥsan al-Kalām presents the Prophetic characteristics within a comprehensive Qur'anic framework that combines theological, ethical, legal, and spiritual dimensions. Its interpretation emphasizes the unique position of the Prophet ﷺ while maintaining the essential distinction between divine attributes and Prophetic qualities. The study further argues that the exegetical discussion of Khaṣāʾiṣ al-Nabawiyyah possesses considerable contemporary relevance, particularly in strengthening understanding of Prophetic authority, promoting reverence for the Prophet ﷺ, and developing an informed and balanced approach to the study of Prophetic personality in contemporary Muslim scholarship.

DOAJ
Academic Resource Index ResearchBib
Journament
CiteFactor
اردو جرائد اشاریہ
Eoi Electronic Object Identifier
I2OR
Cosmos

Keywords: Khaṣāʾiṣ al-Nabawiyyah; Prophet Muhammad ﷺ; Tafsīr Aḥsan al-Kalām; Qur'anic Exegesis; Prophetic Characteristics; Prophetic Authority; Islamic Theology; Contemporary Relevance.

تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو آخری نبی و رسول کی حیثیت سے ایک جامع اور عالمگیر منصب عطا فرمایا۔ قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کو انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ قرار دیا اور آپ ﷺ کی اطاعت و اتباع کو ایمان اور فلاح کے ساتھ مربوط کیا۔ آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اخلاق، عبادات، معاشرت، قیادت اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں کامل رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے متعدد ایسے امتیازی اوصاف اور خصوصی احکام عطا فرمائے جو آپ ﷺ کے مقام و مرتبہ کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان خصوصی اوصاف و احکام کو علمی اصطلاح میں خصائصِ نبوی ﷺ کہا جاتا ہے۔ ان میں آپ ﷺ کے منصبِ رسالت، خاتمیت، عالمگیریتِ دعوت، وجوبِ اطاعت، مقامِ اسوۂ حسنہ اور دیگر امتیازی خصوصیات شامل ہیں۔ خصائصِ نبوی ﷺ کا مطالعہ قرآنِ کریم کے تصورِ رسالت اور مقامِ نبوت کو سمجھنے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اردو تفسیری ادب میں تفسیر احسن الکلام ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ اس میں قرآنِ کریم کی تشریح کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ کے اوصاف، مقام، منصبِ رسالت اور متعلقہ خصوصیات کو مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ زیرِ نظر تحقیق میں "تفسیر احسن الکلام میں خصائصِ نبوی ﷺ: تفسیری منہج، امتیازات اور معاصر معنویت کا تجزیاتی مطالعہ" کے تحت خصائصِ نبوی ﷺ سے متعلق قرآنی آیات کا جائزہ لیتے ہوئے مفسر کے منہجِ تفسیر، روایتی و تفسیری مصادر سے استفادہ اور بیان کردہ امتیازات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔

موجودہ دور میں مقامِ رسالت اور سیرتِ نبوی ﷺ سے متعلق مختلف علمی و فکری مباحث کے تناظر میں خصائصِ نبوی ﷺ کو قرآن و تفسیر کی روشنی میں واضح کرنا خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے تفسیر احسن الکلام میں خصائصِ نبوی ﷺ کا مطالعہ اردو تفسیری ادب میں ایک مفید علمی اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر میں مقامِ رسالت کے درست اور متوازن فہم کے لیے بھی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

تفسیر احسن الکلام کا تعارف

تفسیر "احسن الکلام" شیخ الحدیث عبد السلام رستمی کی ایک جامع علمی و تحقیقی کاوش ہے، جو اپنے اسلوب میں سلف صالحین کے منہج کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس تفسیر کی بنیادی خصوصیت قرآن کریم کی آیات کی وضاحت خود قرآن کی دیگر آیات اور احادیثِ صحیحہ سے کرنا ہے، جس سے تفسیری مباحث میں استناد اور پختگی پیدا ہوتی ہے۔ شیخ رستمی نے اس میں عقیدۂ توحید کی وضاحت، ردِ شرک اور اتباعِ سنت پر خصوصی زور دیا ہے، جبکہ مشکل لغوی و نحوی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے عربی ادب اور قواعدِ زبان سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ یہ تفسیر نہ صرف عام قارئین کے لیے فہمِ قرآن کا بہترین ذریعہ ہے، بلکہ اپنے محققانہ انداز اور علمی گہرائی کی بدولت اکیڈمک سطح پر سیرتِ طیبہ اور دیگر قرآنی علوم پر تحقیق کرنے والے طلبہ کے لیے بھی ایک مستند اور کلیدی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

تفسیر احسن الکلام علماء کی نظر میں

تفسیر احسن الکلام کو علمی و تحقیقی حلقوں میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور اہل علم نے اسے عصرِ حاضر کی ایک جامع اور مستند علمی خدمت قرار دیا ہے۔" محققین کے نزدیک اس تفسیر کا اصل حسن مفسر کا وہ اسلوب ہے جس میں انہوں نے 'تفسیر القرآن بالقرآن' کے اصول کو کمال مہارت سے برتا ہے، جو طالب علموں کے لیے فہمِ قرآن کی راہوں کو متعین کرتا ہے۔ جید علما کی رائے میں یہ تفسیر عقیدہِ سلف کی ترجمانی اور اتباعِ سنت کے باب میں ایک مضبوط علمی ڈھال کی حیثیت رکھتی ہے، جس میں روایتی تفسیری منہج کو جدید اسلوبِ بیان کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے۔"[1]

ماہرینِ فن نے اس کے علمی استدلال، لغوی تحقیقات اور فقہی باریکیوں کی تعریف کرتے ہوئے اسے نہ صرف ایک بہترین تعلیمی نصاب، بلکہ محققین کے لیے ایک ناگزیر مرجع (Reference) تسلیم کیا ہے، جو قرآنی تعلیمات کو عام فہم اور مدلل انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سببِ تالیف

تفسیر احسن الکلام کی تالیف کا بنیادی سبب شیخ عبد السلام رستمی رحمہ اللہ کا وہ طویل تدریسی سفر اور دعوتی جذبہ تھا جو انہوں نے دہائیوں تک دورہِ تفسیرِ قرآن کی صورت میں جاری رکھا۔ شیخ نے محسوس کیا کہ پشتو زبان میں ایک ایسی جامع اور مستند تفسیر کی ضرورت ہے جو خالصتاً سلف صالحین کے منہج اور 'تفسیر القرآن بالقرآن والحدیث' کے اصولوں پر مبنی ہو، تاکہ مقامی لوگ اپنی مادری زبان میں قرآن کے اصل پیغام اور عقیدہِ توحید کو بلا آمیزش سمجھ سکیں۔ آپ کا مقصد صرف ایک کتاب مرتب کرنا نہیں تھا، بلکہ ان بکھرے ہوئے دروسِ قرآن کو علمی و تحقیقی قالب میں ڈھالنا تھا جو آپ نے سالہا سال اپنے شاگردوں کو دیے۔ اس تالیف کا ایک اہم محرک معاشرے میں موجود رسوم و رواج اور اعتقادی کمزوریوں کی اصلاح کرنا اور طالب علموں کے لیے ایک ایسا علمی مرجع فراہم کرنا تھا جو لغوی، نحوی اور فقہی مباحث میں قرآن و سنت کے دلائل کو تمام آرا پر مقدم رکھے۔[2]

تفسیر احسن الکلام "میں خصائص النبی ﷺ

آپ ہماری نظروں میں ہیں

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا"[3]

"اور آپ اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کیجیے۔"

شیخ عبد السلام رستمی لکھتے ہیں کہ:

> مکہ میں مشرکین کی طرف سے دی جانے والی اذیتوں اور تکالیف کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو "صبر" کی تلقین فرمائی۔ ان کے نزدیک "لحکم ربک" (اپنے رب کے حکم کے لیے) کا مطلب یہ ہے کہ دعوتِ دین کے راستے میں جو بھی مشکلات آئیں، انہیں اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا جائے۔ یہ صبر بزدلی نہیں بلکہ ایک عظیم مشن کی تکمیل کے لیے ضروری قوت ہے۔"[4]

شیخ رستمی اس جملے کی تفسیر میں ایک بہت ہی لطیف اور گہرا نکتہ بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "اے محمد ﷺ! آپ ہماری خصوصی حفاظت، نگرانی اور رعایت میں ہیں۔" شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ جب کائنات کا خالق یہ کہہ دے کہ آپ

میری آنکھوں کے سامنے ہیں، تو پھر دشمن کی کوئی چال یا سازش آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ آیت سیرتِ نبوی کے اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے کہ مکی دور کے بدترین حالات میں بھی آپ ﷺ تنہا نہیں تھے بلکہ اللہ کی نصرت آپ کے ساتھ تھی۔[5]

شیخ رستمی "وسبح بحمد ربک" کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"جب حالات مشکل ہو جائیں اور مخالفین کا دباؤ بڑھے، تو داعیِ حق کے لیے سب سے بڑا سہارا اللہ کی تسبیح اور حمد ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ذکرِ الٰہی سے دل کو وہ سکون ملتا ہے جو پہاڑ جیسی مشکلات کو بھی آسان کر دیتا ہے۔ "حین تقوم" کی تفسیر میں وہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد نیند سے اٹھنا، مجلس سے اٹھنا یا نماز کے لیے کھڑا ہونا ہے، اور یہ ہر حال میں اللہ کی یاد کا درس ہے۔"[6]

شیخ رستمی اپنے مخصوص سلفی اسلوب میں یہاں اللہ کی صفتِ "عین" (آنکھ) کے حوالے سے بھی بحث کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہمیں اللہ کی صفات پر ویسے ہی ایمان لانا چاہیے جیسے قرآن میں آئیں، بغیر کسی تشبیہ یا تاویل کے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا اصل پیغام یہ ہے کہ اللہ اپنے پیارے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا، خاص طور پر جب وہ اس کے دین کی سربلندی کے لیے کوشاں ہوں۔[7]

سورہ طور مکی صورت ہے۔ اور مکہ کے اندر جو سورتیں نازل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر کا یہی مزاج ہے کہ جو مشرکین کا وطیرہ تھا، جو وہ رد عمل کرتے تھے، مختلف اعتراضات کرتے تھے اور بے سکی ہانکتے تھے، مکی سوتوں میں ان کا ذکر ہے۔ تو ان میں سے اکثر کے جواب کہ وہ یہ کر رہے ہیں تو آپ ﷺ ان کو یہ جواب دیں۔ اور مشرکین ایسا سوچتے ہیں تو ایسا کیوں ہے؟ تو ان سورتوں میں ان کو جواب دیا جاتا تھا۔ اور دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جاتی تھی اور اسلام ابھی ابتدائی مراحل میں تھا۔ کیونکہ نبی کریم صلی علیم کی 13 سال کی جو ایک لمبی جدوجہد ہے اس میں صرف چند سو افراد مسلمان ہوئے۔ تو 13 سال میں ایک ایک دو دو چار چار بندوں کا آہستہ آہستہ شامل ہونا یہ ایک بڑی طویل جدوجہد ہے۔

اور اسی طرح کا مضمون ہے ایک سورہ کا جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

"يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ"[8]

"اے رسول! پہنچا دے جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے اور اگر تو نے نہ کیا تو تو نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تجھے لوگوں سے بچائے گا۔ بے شک اللہ کافر لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔

"يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ"

اللہ کے رسول جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے اس کو پہنچا دیجیے۔

"وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ"

اگر اپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے گویا رسالت کا حق ادا ہی نہیں کیا، پیغام نہیں پہنچایا۔

"وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ"

اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

تو جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس سے پہلے آپ ﷺ کے گھر کے باہر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پہرا دیا کرتے، چونکہ

مدینہ میں خطرہ تھا، مشرکین کی دھمکیاں وغیرہ لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی واللہ یعصمک من الناس تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ اٹھایا اور کہا کہ آپ گھر کو چلے جاؤ کیونکہ اللہ نے میری حفاظت کا ذمہ لے لیا لہذا اس کے بعد جو آپ ملی کام کے گھر کے باہر پہرے والی صورت نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح بہت سی آیات میں نبی کریم ﷺ کو تسلی اور تشفی دی جارہی ہے۔

"فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌo لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ"[9]

"پس تو نصیحت کر، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے۔ تو ہرگز ان پر کوئی مسلط کیا ہوا نہیں ہے"۔

اور مزید یہ ارشاد فرمایا کہ:

"فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا"[10]

"پس شاید تو اپنی جان ان کے پیچھے غم سے ہلاک کر لینے والا ہے، اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے"۔

آپ اتنا پریشان اور حلقان کیوں ہوتے ہیں اور پھر اگر آپ کا بس چلے تو چلیں پھر کوئی آسمان میں آپ سیڑھی ہے تو نکال لائیں، اور زمین سے کچھ نکال لائیں۔ اور پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ ساری نشانیاں بھی ان کے سامنے رکھ دیں تو بھی یہ نہیں مانیں گے اور اسی سورت کی ایک آیت میں ہے کہ اگر یہ آسمان سے کوئی اس کا ٹکڑا اگر گرتا دیکھ لیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو تہہ باتہہ بادل ہیں۔ تو یہ آپ ﷺ سے تسلی اور صبر کا حکم ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کل انسانیت کی طرف ہے

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"[11]

"اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

شیخ عبد السلام رستمی لکھتے ہیں کہ:

سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام ایک مخصوص قوم یا خاص علاقے کی طرف بھیجے جاتے تھے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی بعثت کسی خاص نسل، رنگ یا ملک کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لفظ "کافۃً للناس" اس بات کی نصِ قطعی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت عالمگیر ہے اور اب نجات صرف آپ ﷺ کی اتباع میں منحصر ہے۔"[12]

شیخ رستمی اس مقام پر ایک گہرا علمی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ جب آپ ﷺ کی رسالت تمام نوعِ انسانی کے لیے عام کر دی گئی، تو اب کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت ختمِ نبوت کی ایک بڑی دلیل ہے، کیونکہ جب ایک ہی رسول کی دعوت تمام دنیا اور تمام زمانوں کے لیے کافی ہو جائے، تو سلسلۂ نبوت مکمل ہو جاتا ہے۔[13]

شیخ رستمی "بشیراًونذیراً" کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ:

"آپ ﷺ کی سیرت کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمانبرداروں کو جنت کی خوشخبری دی اور نافرمانوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ "تبشیر" (خوشخبری) اور "انذار" (ڈرانا) کسی خاص

گروہ کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو دعوتِ حق کو سنے، چاہے وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔
"[14]

آیت کے آخری حصے "ولکن اکثر الناس لایعلمون" کی تفسیر میں شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ اکثریت کی لاعلمی یا انکار سے حق کی عالمگیریت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مشرکینِ مکہ کا یہ خیال غلط تھا کہ آپ ﷺ صرف ان کے لیے آئے ہیں، بلکہ آپ ﷺ کی رسالت کا سورج پوری دنیا کو روشن کرنے کے لیے طلوع ہوا ہے، چاہے اکثر لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکیں۔[15]

شیخ رستمی نے رسول اللہ ﷺ کو کسی جغرافیائی حد میں مقید نہیں کیا بلکہ آپ ﷺ کو "محسنِ انسانیت" کے طور پر پیش کیا ہے جن کا پیغام ہر انسان کے لیے باعثِ رحمت ہے۔ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اسلام کا مخاطب انسان کا "عقیدہ اور قلب" ہے، نہ کہ اس کا قبیلہ یا نسل۔

یہ آیت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پوری انسانیت کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبوت کی دلیل ہے اور اسی چیز کی تکمیل اور انتہا وہ آئین ہے۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَ تْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا"[16]

"آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔"

شیخ عبد السلام رستمی لکھتے ہیں کہ:

"یہ آیت اس بات کا حتمی اعلان ہے کہ اب شریعتِ محمدی ﷺ میں کسی قسم کی کمی باقی نہیں رہی۔ وہ فرماتے ہیں کہ عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاقیات کے تمام اصول وضوابط قیامت تک کے لیے وضع کر دیے گئے ہیں۔ ان کے نزدیک "تکمیل" کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ دین ہر دور اور ہر خطے کی انسانیت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے اور اسے کسی سابقہ شریعت یا انسانی قانون کی حاجت نہیں رہی۔"[17]

شیخ رستمی "اتممت علیکم نعمتی" کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہاں "نعمت" سے مراد ہدایتِ الٰہی اور وہ غلبہ ہے جو اللہ نے مسلمانوں کو فتحِ مکہ اور حجۃ الوداع کے موقع پر عطا فرمایا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کے مشن کو اس مقام تک پہنچا دیا جہاں کفر مغلوب ہو گیا اور توحید کا جھنڈا سربلند ہوا۔ شیخ رستمی کے مطابق، یہ نعمت محض دنیاوی کامیابی نہیں بلکہ ابدی نجات کا راستہ ہے۔[18]

شیخ رستمی اپنے مخصوص علمی اسلوب میں اس آیت سے بدعت کے بطلان پر استدلال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"جب اللہ نے دین کو "مکمل" قرار دے دیا، تو اب جو شخص دین میں اپنی طرف سے کوئی نیا عمل (بدعت) ایجاد کرتا ہے، وہ گویا زبانِ حال سے یہ دعویٰ کرتا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ نے دین ادھورا چھوڑا تھا جسے وہ مکمل کر رہا ہے۔ شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ جو چیز عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں "دین" نہیں تھی، وہ قیامت تک دین نہیں بن سکتی۔"[19]

آیت کے آخری حصے کی تشریح میں شیخ رستمی رقمطراز ہیں کہ اللہ نے صرف "اسلام" کو انسانیت کے لیے نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسلام کے علاوہ کوئی بھی نظریہ یا مذہب اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اسلام ہی

وہ فطری دین ہے جس پر چل کر انسان خالقِ کائنات کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔[20]
شیخ عبد السلام رستمی کی اس تفسیر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حجۃ الوداع کے موقع پر اس آیت کا نزول سیرتِ نبوی ﷺ کے مشن کی "تکمیلی سند" ہے۔ شیخ رستمی نے اس آیت کو صرف ایک تاریخی اعلان نہیں، بلکہ ایک مستقل دستوری ضابطہ قرار دیا ہے جو مسلمانوں کو مابعدِ وصالِ نبوی ﷺ اپنی زندگی قرآن و سنت کے مطابق گزارنے کا پابند بناتا ہے۔ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اسلام کا ڈھانچہ اب مکمل ہے اور اس میں کسی بھی قسم کی پیوند کاری کی گنجائش نہیں۔
یعنی جس نبی کو اللہ نے پوری خلقت کے لیے نبی بنا کر بھیجا ہے تو ضروری ہے کہ اس نبی کے پاس آنے والا دین جو کہ ہدایت ہے وہ مکمل بھی ہو۔ اگر وہ ناقص ہوتی، کچھ وقت کے لیے ہوتی، قیامت تک کے لیے اس کے اندر تمام چیزوں کا جواب اور انسانوں کے مسائل کا حل نہ ہوتا تو ایک مخصوص وقت کے بعد پھر وہ قابل عمل نہ رہتی۔ جیسے آج سے 100 سال پہلے جو سائنس کی کتابیں لکھی گئی وہ اس دور کے لیے ٹھیک تھی لیکن آج جو تحقیق ہو گئی وہ اتنی ایڈوانس ہو گئی کہ اب ان کتابیں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے، ان میں کئی غلطیاں ہیں جو اب سامنے آگئی ہیں۔ تو اگر ایسا ہوتا تو چند صدیوں کے بعد دین کا بھی یہی حال ہوتا۔ قرآن جب نازل ہوا تھا اس دور کے تقاضوں کے مطابق تو ہدایت دے رہا تھا اور چند صدیوں بعد نعوذ باللہ نعوذ باللہ اگر یہ مکمل نہ ہوتا اور اللہ کی طرف سے نہ ہوتا تو عاجز آجاتا۔ تو قرآن کا ہر وقت ہدایت کا سامان مہیا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے جو دین نازل کیا ہے ایک تو اس کو مکمل کر دیا، دوسرا اس کو رہتی دنیا تک کے لیے اللہ نے ہدایت بنا دیا ہے۔

"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ"[21]

"اور ہم نے تجھے نہیں بھیجا مگر جہانوں پر رحم کرتے ہوئے"۔

"كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا"[22]

"تمام لوگوں کیلئے خوشخبری دینے والا اور ڈرسنانے والا بنا کر بھیجا ہے"۔

کہ ہم نے تمام انسانیت کے لیے آپ کو مبعوث کیا ہے تاکہ آپ ان کو خوشخبری بھی سنائیں کہ اگر وہ اچھے اعمال کریں گے تو ان کے لیے جنت ہے اور ڈرائیں بھی کہ اگر وہ اللہ کے احکامات کو نہیں مانیں گے تو بڑا سخت عذاب ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص اور امتیازات جو اللہ رب العزت نے ان کو عطا فرمائے ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ آپ کی دعوت، آپ کی نبوت ان دونوں مکلف مخلوقات (جنوں اور انسانوں) جن سے اللہ نے حساب و کتاب لینا ہے اور جن سے پوچھ کچھ بھی ہونی ہے ان دونوں مخلوقات کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بنا کر بھیجا۔ اور اسی خاصے کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا دورانیہ لامتناہی ہے یعنی جو حد ہے دنیا کی زندگی کی اتنی ہی حد ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی۔ تو یہ کمال اور یہ خاصہ اس سے پہلے کسی نبی کو حاصل نہیں ہوا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے بنی اسرائیل میں نبی آرہے تھے لیکن کسی نبی نے بھی آکے مکہ مکرمہ میں دعوت نہیں دی۔ حتیٰ کہ بیت اللہ ہزاروں سال سے موجود تھا۔ لیکن کوئی بنی اسرائیل نبی بیت اللہ میں رہنے والوں کو تبلیغ نہیں کرنے آیا۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت جب یہاں سے نکلی تو پوری دنیا میں آپ ﷺ نے اپنا پیغام پہنچا دیا، حکمرانوں کو خط لکھے۔ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پھر اس کے بعد ان علاقوں کو فتح بھی کیا۔ تو یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ و امتیاز ہے کہ آپ کی دعوت ایک تو تمام انسانیت کے لیے اور دوسرا جب تک اللہ چاہے دنیا قائم رہے گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چلتی

رہے گی۔

آپ ﷺ کی بعثت مومنین کے لیے اللہ رب العزت کا احسان عظیم ہے

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"[23]

"بلاشبہ یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس نے ان میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے"۔

شیخ عبد السلام رستمی کی اس تفسیر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی ﷺ کا اصل مقصود انسانیت کی باطنی اصلاح اور قرآن و سنت کی تعلیم ہے۔ شیخ رستمی نے "حکمت" کو سنت کے مترادف قرار دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اقوال و افعال قرآن کی عملی اور لازمی تشریح ہیں۔ یہ آیت سیرت کے تعلیمی اور تربیتی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے بہترین بنیاد فراہم کرتی ہے۔

کیونکہ اس ذات کا حصہ تھے جو نیچے آئے ہوئے تھے تو اگر وہاں اوپر چلے گئے تو کیا کمال ہو گیا؟ انہوں نے مشقتیں اور آزمائشیں جھیلیں اور وہ استقامت سے ڈٹے رہے، اور وہ بدر میں کھڑے ہوئے اور وہ حنین میں کھڑے رہے یعنی ان کو تو خوف ہی نہیں ان کے اوپر تو وہ چیزیں وارد ہی نہیں ہیں۔ تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ فرشتہ نبی ہو تو ہم اعتراض کرتے ہیں۔

تو وہ بھائی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے نور میں سے نور اللہ کی ذات کا حصہ قرار دیتے ہیں تو وہ کسی طرح اس بات کو Justify کر سکتے ہیں؟ کہ ہم مٹی سے بنے ہیں اور ہمارے لیے نمونہ وہ ہو جو نور ہو۔ یعنی عام نور بھی نہیں جس سے اللہ سے فرشتوں کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ اللہ رب العزت کی ذات کے نور میں سے نور ہونا۔ تو ذات کی کتنی صلاحیت ہے وہ کیسے نمونہ ہو سکتا ہے۔ پھر تو درجہ ہی نہیں بنتا۔ تو جس کا وجود اقدس اللہ کے نور سے تشکیل دیا گیا ہو وہ مٹی سے بنے ہوؤں کے لیے نمونہ کیسے ہو سکتا؟ کیسے اس کی پوری زندگی نمونہ ہو سکتی ہے؟

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت، مقام اور مرتبہ اسی میں ہے کہ آپ ﷺ آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں لیکن مقام اور مرتبے میں کوئی نبی بھی اور کوئی فرشتہ بھی ان کے قریب نہیں پہنچتا۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف میں بیان کیا جا رہا ہے کہ:

"يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ"[24]

"جو ان پر اس کی آیات پڑھتا اور انھیں پاک کرتا اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے"۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی تلاوت کرنے والے، تزکیہ نفس کرنے والے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب و حکمت کی تعلیم دینے والے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت سے پہلے گمراہی تھی، جہالت تھی، اندھیرا تھا اور اب بھی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

یہ ہدایت اور ساری تعلیمات موجود نہیں ہیں وہاں جہالت ہی ہے، اندھیرا ہی ہے۔ چونکہ جو چیز جہالت کو دور کر سکتی ہے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت ہی ہے۔

امتِ وسط کی تعریف اور مفہوم

شیخ عبدالسلام رستمی لکھتے ہیں کہ "وسط" کا لغوی معنی درمیان ہے، لیکن یہاں اس سے مراد "عادل اور بہترین" امت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کو یہ لقب اس لیے دیا گیا کیونکہ یہ عقائد اور اعمال میں افراط و تفریط (انتہاء پسندی) سے پاک ہے۔ یہ امت پچھلی امتوں کے مقابلے میں عدل وانصاف پر قائم ہے، جس کا نمونہ سیرتِ نبوی ﷺ نے عملی طور پر پیش کیا۔[25]

شیخ رستمی اس مقام پر ایک گہرا علمی نکتہ بیان کرتے ہیں کہ:

> "قیامت کے دن جب سابقہ امتیں اپنے انبیاء کی تبلیغ کا انکار کریں گی، تو امتِ محمدیہ ﷺ قرآن کی دی ہوئی خبر کی بنیاد پر گواہی دے گی کہ تمام انبیاء نے اپنا پیغام پہنچا دیا تھا۔ شیخ رستمی کے نزدیک یہ اس امت کا ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو اسے اپنے نبی ﷺ کی برکت سے حاصل ہوا۔"[26]

آیت کے دوسرے حصے کی تشریح میں شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ جس طرح امت تمام لوگوں پر گواہ ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ اس امت پر گواہ ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ نے امت کو دینِ حق مکمل طور پر پہنچا دیا اور ان کے اعمال کی نگرانی فرمائی۔ شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ سیرتِ نبوی ﷺ کا ہر پہلو اس گواہی کی بنیاد ہے کہ آپ ﷺ نے امانتِ الٰہی کو پوری دیانت سے ادا فرمایا۔[27]

شیخ رستمی اس آیت کے سیاق و سباق (تحویلِ قبلہ) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بیت اللہ کو قبلہ بنانا دراصل ایمان والوں اور منافقوں کے درمیان ایک امتحان تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ سیرت کے اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ اصل نیکی جہتوں میں نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی بے چون وچرا اطاعت میں ہے۔[28]

اس تفسیر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امتِ مسلمہ کی فضیلت کا مدار اس کے "عدل" اور "اتباعِ رسول ﷺ" پر ہے۔ شیخ رستمی نے رسول اللہ ﷺ کو اس امت کے لیے "میزان" (ترازو) قرار دیا ہے، یعنی امت کی ہر گواہی اور ہر عمل تبھی معتبر ہو گا جب وہ سنتِ نبوی ﷺ کے معیار پر پورا اترے گا۔ یہ آیت سیرتِ نبوی کے اس عالمی مشن کو اجاگر کرتی ہے جس میں نبی ﷺ کو پوری کائنات کے لیے مرکز و محور بنایا گیا ہے۔

اور جیسے آپ کے خصائص ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور خصائص کی بنیاد پر ہی امت محمدیہ کو یہ فضیلت ملی کہ وہ دعوت و تبلیغ کا کام بھی کریں کیونکہ پہلے دعوت و تبلیغ کا کام صرف نبی کیا کرتے تھے، امتیوں کی ذمہ دار نہیں ہوتی تھی وہ جائیں اور دعوت دیں۔ آپ ﷺ کو اللہ نے خاتم النبیین بنایا تو اس کے بدلے میں پوری امت کو یہ اعزاز بخشا کہ نبیوں والا دعوت و تبلیغ کا کام ان کے ذمے آجائے۔

ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں نبی آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف آل میں ہی نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی کو اللہ تعالی نے یہ فضیلات بخش دی کہ وہ نبیوں والا کام کرے۔ فرمایا کہ تم بہترین امت ہو اور تمام انسانیت کے نکالے گئے ہو۔

ازواجِ مطہرات کی حلت اور مہر کی اہمیت

شیخ عبدالسلام رستمی لکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے نبی ﷺ کے لیے ان خواتین کو حلال قرار دیا جن کا مہر ادا کر دیا گیا ہو۔ وہ یہاں یہ نکتہ

بیان کرتے ہیں کہ اگرچہ آپ ﷺ کی مراعات عام مسلمانوں سے مختلف تھیں، لیکن مہر کی ادائیگی سنتِ نبوی کا ایک لازمی حصہ رہی ہے، جو خواتین کے معاشی حقوق کے تحفظ کی علامت ہے۔[29]

آیت کے اس حصے (التی ھاجرن معک) کی تشریح میں شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح کی اجازت کو "ہجرت" کے ساتھ مشروط کیا گیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ شرط اس دور کے مخصوص حالات (مکہ سے مدینہ ہجرت) کے پیشِ نظر تھی، تاکہ ایمان اور ہجرت کی فضیلت کو نکاح جیسے اہم سماجی بندھن میں بھی نمایاں کیا جا سکے۔[30]

شیخ رستمی اس مقام پر دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بعض معاملات میں عام مومنین سے مستثنیٰ قرار دیا (جیسے چار سے زائد ازواج یا ہبہ کا معاملہ)۔ شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ یہ مراعات کسی دنیاوی لذت کے لیے نہیں تھیں، بلکہ ان کے پیچھے دعوتِ دین کی مصلحتیں، قبائلی تعلقات کی استواری اور بیوہ خواتین کی سرپرستی جیسے عظیم مقاصد کارفرما تھے۔[31]

شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی مومنہ عورت بغیر مہر کے اپنے آپ کو نبی ﷺ کے لیے پیش کرے (ہبہ)، تو یہ حق صرف آپ ﷺ کا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں اس اختیار کو استعمال نہیں فرمایا۔ وہ یہاں یہ علمی نکتہ پیش کرتے ہیں کہ قرآن نے یہ رخصت دے کر آپ ﷺ کے مقام و مرتبے کو بلند کیا، مگر آپ ﷺ کی سیرت نے "عفت و پاک دامنی" اور "عدل" کی وہ مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک کے لیے نمونہ ہیں۔[32]

سورہ الاحزاب کی یہ آیت سیرتِ نبوی کے "خاندانی اور قانونی" پہلوؤں کو منظم کرنے کے لیے نازل ہوئی۔ شیخ رستمی نے ان احکامات کو "خصوصی قانون"(Special Law) قرار دیا ہے جو صرف رسول اللہ ﷺ کے منصبِ نبوت کے شایانِ شان تھا۔ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کی عائلی زندگی کا ہر پہلو وحیِ الٰہی کے تابع تھا، جس کا مقصد امت کے لیے ایک پاکیزہ معاشرتی نظام کی بنیاد رکھنا تھا۔

تو یہ سارے خصائص آپ ﷺ کو عام انسانوں سے بڑھ کر حاصل تھے۔ اسی طرح اللہ رب العزت نے آپ ﷺ کو اجازت دی کہ وہ چار سے زیادہ شادیاں کر لیں۔ دیکھیں اللہ ہی ہے جس نے تمام انسانوں اور مردوں کے لیے چار شادیوں کی شرط لگائی ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو کوئی اس کو مقرر کر سکتا تھا؟ اللہ چاہتا ہے تو تین کر دیتا ہے، اللہ چاہتا تو سات مقرر کر دیتا لیکن اس نے تمام مسلمان مردوں کے لیے چار کی شرط لگا دی، وہی رب ہے وہ اپنے نبی سے اس پابندی کو ہٹا رہا ہے۔

تو وہی رب ہے اسی کی مرضی اور منشا ہے وہ جس چیز کو جیسے چاہے حلال کر دے، حرام کر دے، جیسے چاہے کسی کو اجازت دے دے۔ تو جب اللہ رب العزت کوئی کام کر رہے ہیں تو اعتراض تو بنتا ہی نہیں ہے۔

ورنہ پھر اس پہ بھی اعتراض ہو کہ اللہ نے نمازیں پانچ کیوں رکھی ہیں؟ سات کیوں نہیں رکھیں؟ تین کیوں نہیں رکھیں؟ اللہ نے رمضان کے روزے کیوں رکھے؟ کسی اور مہینے کے رکھ دیتا۔ حج فلاں مہینے میں کیوں نہیں رکھا؟ یعنی یہ تو اعتراض بنتا ہی نہیں ہے کہ اللہ رب العزت نے کوئی حکم کیوں نازل کیا؟ نماز میں سجدے دو کیوں رکھے؟ رکوع ایک کیوں رکھا؟ اور فجر کی رکعتیں دو اور عصر کی چار کیوں ہیں؟ مغرب کی تین کیوں ہیں؟ یہ سب اس کی مرضی اور منشا تھی اس نے جو چاہا حکم دیا اور وہ اس کا حقدار ہے۔ اللہ رب العزت کے کسی فیصلے پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا تو یہ بھی اللہ کا فیصلہ ہے کہ اس نے آپ ﷺ کو اجازت دے دی۔ تو جب اجازت دینے والی ذات اللہ کی ہے تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ اس پر کوئی بحث کی جائے۔

امت کے ساتھ قربِ خاص:

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"اَلنَّبِىُّ اَوۡلٰى بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ وَاَزۡوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمۡ"[33]

" یہ نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق رکھنے والا ہے اور اس کی بیویاں ان کی مائیں ہیں"۔

شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "اولیٰ" کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا حق مومنوں پر ان کی اپنی جانوں، مال اور اولاد سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان کی اپنی خواہش ایک طرف ہو اور نبی ﷺ کا حکم دوسری طرف، تو مومن پر فرض ہے کہ وہ اپنی خواہش کو قربان کر کے نبی ﷺ کے حکم کو مقدم رکھے۔

آپ نے اس نکتے پر زور دیا ہے کہ ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ان کی اطاعت تمام دنیاوی رشتوں اور اپنی ذات سے بڑھ نہ جائے۔ آپ نے اس سلسلے میں بخاری کی وہ حدیث بھی نقل کی ہے جس میں نبی ﷺ نے فرمایا: "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والد، اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤ۔

شیخ عبد السلام رستمی بعض مفسرین اور قدیم نسخوں کے حوالے سے یہ بھی ذکر کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مومنوں کے لیے "روحانی باپ" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے آپ ﷺ کی شفقت اور خیر خواہی امت کے لیے کسی بھی سگے باپ سے کہیں زیادہ ہے۔

آیت کے اگلے حصے "وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ" کی وضاحت میں شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ نبی ﷺ کی بیویاں تمام مومنوں کی مائیں ہیں۔ یہ ممتا "حرمت اور احترام" کے لحاظ سے ہے، یعنی:

1۔ نبی ﷺ کے بعد ان سے نکاح کرنا ابدی طور پر حرام ہے۔

2۔ ان کا ادب و احترام ہر مومن پر واجب ہے۔

تاہم، فقہی احکام (جیسے وراثت، پردہ اور محرمیت) میں وہ سگی ماؤں کی طرح نہیں ہیں (یعنی ان کے بھائیوں سے پردہ ختم نہیں ہوتا یا وہ وراثت کی حقدار نہیں بنتیں)۔

شیخ رستمی نے اس آیت کے سیاق و سباق میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ اس آیت کے ذریعے انصار و مہاجرین کے درمیان ہونے والی "مواخات" (بھائی چارے) کی بنیاد پر ہونے والی وراثت کو ختم کر کے اسے قریبی رشتہ داروں "أُولُوا الْأَرْحَامِ" کی طرف منتقل کر دیا گیا۔

نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور ان کا فیصلہ ہر مومن کے لیے اس کی اپنی رائے اور ذاتی مفاد پر مقدم ہے۔ آپ ﷺ کی یہ "اولویت" محض قانونی نہیں بلکہ ایمانی اور قلبی ہے، جو کہ ازواجِ مطہرات کے احترام اور امہات المؤمنین کے تقدس سے جڑی ہوئی ہے۔[34]

نبی کریم ﷺ مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔ یعنی کسی شخص کا اپنی ذات پر، اپنے نفس پر جتنا حق ہے اس سے بھی زیادہ اس کی ذات پر آپ ﷺ کا حق ہے۔ یہ آپ ﷺ کی فضیلت اور آپ ﷺ کا یہ اعزاز ہے اور آپ کا اللہ رب العزت نے یہ حق رکھا۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ"[35]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے والدین سے، اس کی اولاد سے اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں"۔

اور اللہ رب العزت کا ارشاد ہے کہ:

"وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا"[36]

" اور کسی مسلمان مرد اور عورت کیلئے یہ نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ فرما دیں تو انہیں اپنے معاملے کا کچھ اختیار باقی رہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کا حکم نہ مانے تو وہ بے شک صریح گمراہی میں بھٹک گیا۔"

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنوں پر حق ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم آجائے تو اس کے بعد کوئی شخص اس پر توجہ نہ کرے، سنے نا، جواب نہ دے، فوراً حاضر نہ ہو تو یہ ممکن نہیں ہے۔ کچھ بھی حال ہے جب آپ ﷺ کا بلاوا آگیا، آپ ﷺ کا پیغام مل گیا تو پھر ہر چیز کو چھوڑ چھاڑ کر آپ ﷺ کے حکم پر لبیک کہنا یہ مومنوں پر لازم اور فرض ہے۔

اور اولیٰ کا مطلب اقرب بھی ہے یعنی زیادہ قربت والا۔ بندے کا باپ بہت قریبی ہوتا ہے، بندے کا بیٹا اس کے بہت قریبی ہوتا ہے اور عزیز و اقارب بہت قریبی ہوتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ قرابتداری، سب سے زیادہ نسبت اور قربت آپ ﷺ کے ساتھ ہے حتیٰ کہ آپ ﷺ کی اس قربت، تعلق اور نسبت کی وجہ سے ہی مسلمان ایک دوسرے پر قربت محسوس کرتے ہیں کہ ہم ایک نبی کے ماننے والے ہیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربت وہ تو بنتی ہی ہے یعنی امتی کی اپنے نبی سے نسبت وہ بہت قریبی ہے اور اس نسبت کا یہ حال ہے کہ امتی کی دوسرے امتی کے ساتھ بھی نسبت ایک قربت والی بن جاتی ہے۔

نبی کریم ﷺ مقامِ محمود پر فائز ہوں گے

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا"[37]

"اور رات کے کچھ حصے میں پھر اس کے ساتھ بیدار رہ، اس حال میں کہ تیرے لیے زائد ہے۔ قریب ہے کہ تیرا رب تجھے مقام محمود پر کھڑا کرے"۔

شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ لفظ "نافلۃ" کا مطلب ہے "زیادہ" یا "اضافی"۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نمازِ تہجد امت کے لیے تو نفل (سنت) ہے، لیکن نبی کریم ﷺ پر یہ نماز ایک اضافی فریضہ کے طور پر واجب تھی۔ آپ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ آپ ﷺ کے درجات کی بلندی اور اللہ سے خاص قربت کا ذریعہ تھی۔

تفسیرِ احسن الکلام میں "مقامِ محمود" کی تشریح احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں کی گئی ہے۔ شیخ رستمی واضح کرتے ہیں کہ:

"اس سے مراد "شفاعتِ کبریٰ" ہے، جو قیامت کے دن صرف نبی کریم ﷺ کا خاصہ ہو گی۔"[38]

یہ وہ مقام ہے جہاں اولین و آخرین (تمام انسان) آپ ﷺ کی تعریف اور حمد کریں گے، اسی لیے اسے 'محمود' (جس کی تعریف کی

گئی ہو) کہا جاتا ہے۔

جب تمام لوگ پریشانی کے عالم میں انبیاء کے پاس جائیں گے اور وہ معذرت کریں گے، تب آپ ﷺ سجدہ ریز ہو کر اللہ کی حمد بیان کریں گے اور شفاعت کا آغاز فرمائیں گے۔

شیخ رستمی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مقامِ محمود کے تذکرے سے پہلے تہجد کا حکم دیا، جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ راتوں کی عبادت، گریہ وزاری اور اللہ کے سامنے طویل قیام ہی انسان کو عظمت اور بلند مقامات تک پہنچاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے چونکہ راتوں کو جاگ کر کمالِ بندگی دکھایا، اسی کے بدلے اللہ نے انہیں مقامِ محمود کی بشارت دی۔

عام عربی میں "عسیٰ" کا مطلب "امید ہے" یا "شاید" ہوتا ہے، لیکن شیخ رستمی (دیگر مفسرین کی طرح) واضح کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے "عسیٰ" کا لفظ آئے تو وہ یقین اور وجوب کے معنی میں ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ یقیناً آپ ﷺ کو اس مقام پر فائز فرمائے گا۔

رات کا قیام امت پر فرض نہیں ہے۔ نمازیں پانچ ہی فرض ہیں لیکن رات کے قیام کی عظمت اور فضیلت بہت زیادہ ہے اور آپ ﷺ کا معمول اتنا تھا کہ شاید ہی زندگی میں کوئی رات گزری ہو جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام نہ کیا ہو۔ مگر وہ رات خاص طور پر قیام نہیں کیا جو آپ ﷺ نے مزدلفہ میں گزاری یعنی آپ ﷺ جب حج پر تھے۔

آپ ﷺ نے ہمیشہ تہجد پڑھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرفات سے مزدلفہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدلفہ آکر مغرب اور عشاء کی نماز اکٹھی ادا کی اور سو گئے اور کوئی قیام نہیں کیا۔ ہماری امت میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے کبھی تہجد نہ پڑھی ہو وہ مزدلفہ جا کر رات کو قیام کرنے لگ جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ اس رات کو سونا سنت ہے، تہجد نہ پڑھنا سنت ہے۔ اور عام زندگی میں جب آپ ﷺ ہمیشہ تہجد پڑھتے تھے اور آپ ﷺ کا یہ معمول تھا۔ جیسے فرمایا کہ:

"يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ o قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا o نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا o اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا"[39]

"اے چادر اوڑھنے والے۔ رات کے تھوڑے سے حصے کے سوا قیام کرو۔ آدھی رات (قیام کرو) یا اس سے کچھ کم کر لو۔ یا اس پر کچھ اضافہ کر لو اور قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"۔

کہ آدھی رات، یا اس سے کچھ کم یا اس سے بھی زیادہ قیام کیجیے۔ تو اللہ رب العزت نے چونکہ ان کو خاص حکم دیا تھا اور جب کوئی تخصیص آجاتی ہے اس طرح کہ جو امت کے لیے فرض نہ بھی ہوتی تو تو نبی کریم ﷺ اس پر دوام اختیار فرماتے اور اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ"[40]

"اور رات کے کچھ حصے میں تہجد پڑھو یہ خاص تمہارے لیے زیادہ ہے"۔

کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نیند کو ترک کر کے رات کو اللہ کے سامنے کھڑے ہو جائیں تاکہ اللہ رب العزت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود پر فائز فرما دے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے اس کو اپنے لیے حکم کے درجے میں لیتے تھے اور مستقل تہجد پڑھا کرتے تھے۔ اور پھر آپ ﷺ کا ایک فرمان ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ میں نے جنت جیسی خوبصورت جگہ نہیں دیکھی کہ

اس کا حاصل کرنے والا رات کو سو یارہ جائے یعنی وہ رات کو قیام نہ کرے اور فرمایا میں نے جہنم جیسی خوفناک جگہ نہیں دیکھی کہ اس سے بچنے والا رات کو۔ اس سے مراد رات کے قیام کے لیے اٹھنا ہے۔

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ"[41]

"کہہ دے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھیں تمھارے گناہ بخش دے گا اور اللہ بے حد بخشنے والا، نہایت مہربان ہے"۔

شیخ عبد السلام رستمی لکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اللہ نے اس دعوے کی سچائی کے لیے ایک "کسوٹی" مقرر کر دی ہے اور وہ ہے رسول اللہ ﷺ کی اتباع۔ شیخ رستمی فرماتے ہیں کہ جو شخص نبی ﷺ کے نقشِ قدم پر نہیں چلتا، اس کا محبتِ الٰہی کا دعویٰ محض ایک زبانی دعویٰ ہے جس کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔[42]

شیخ رستمی اس مقام پر سلفِ صالحین کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

"یہ آیت ان لوگوں کے لیے "امتحان" ہے جو وجد، حال اور من گھڑت طریقوں سے اللہ کا قرب چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اللہ کا محبوب بننے کا راستہ مکے اور مدینے کی گلیوں سے گزرتا ہے، یعنی محمد ﷺ کی سیرت کی پیروی ہی وہ واحد راستہ ہے جو خالق کی محبت تک پہنچاتا ہے۔"[43]

شیخ رستمی ایک باریک نکتہ بیان کرتے ہیں کہ انسان کا اللہ سے محبت کرنا اتنا کمال نہیں، جتنا کمال اللہ کا انسان سے محبت کرنا ہے۔ اور یہ مقامِ محبوبیت صرف اتباعِ رسول ﷺ سے حاصل ہوتا ہے۔ آیت کے اگلے حصے (ویغفر لکم ذنوبکم) کی تشریح میں وہ لکھتے ہیں کہ اتباعِ سنت کی برکت سے اللہ نہ صرف اپنی محبت عطا کرتا ہے بلکہ انسان کے پچھلے گناہوں پر پردہ ڈال کر انہیں معاف بھی فرما دیتا ہے۔[44]

شیخ رستمی اپنے مخصوص علمی اسلوب میں لکھتے ہیں کہ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات (عقیدہ، عبادت، سیاست، اور معاشرت) میں صرف نبی ﷺ کے طریقے کو تسلیم کرے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص دین میں بدعات ایجاد کرتا ہے، وہ دراصل اتباعِ رسول ﷺ کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے، اور ایسے شخص کا عمل اللہ کے ہاں مردود ہے۔[45]

انتہائی اہم ہے کہ شیخ رستمی نے "محبت" کو "اتباع" کے ساتھ مشروط کر کے تصوف کے ان نظریات کی تردید کی ہے جو سنتِ نبوی سے آزاد ہو کر اللہ تک پہنچنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ اسلام میں عشقِ رسول ﷺ کا ثبوت دراصل اتباعِ رسول ﷺ ہے۔ مقامِ رسول ہے۔

انسان چاہتا ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے قریب ہو جائے، اللہ سے محبت کرے۔ تو اللہ سے محبت جو کرتا ہے اس کی محبت اس وقت ہی قبول ہو گی جب وہ آپ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کرے گا۔ یہاں پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ درجہ بیان کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اطاعت کرنے کا انعام یہ ملے گا کہ صرف یہ نہیں کہ انسان کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ اللہ رب العزت سے محبت کرتا ہے اور وہ قبول ہو جائے گا بلکہ قبولیت کے ساتھ ساتھ مزید یہ انعام ہے کہ اللہ اس بندے سے بھی محبت کرتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

کیونکہ ہم تو اللہ کی مخلوق ہیں، اللہ کے بندے ہیں ہم نے تو دم بھرنا ہی ہے اس کی محبت کا بھلے اس میں کتنی سچائی ہو یا نہ بھی ہو، ہماری

یہ باتیں، سوچیں، دعوے سارے اپنی جگہ ہیں۔ لیکن اس شخص کا کیا کہنا کہ جس کے دعوے کو اس قدر قبول کر لیا گیا خود اللہ بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔ تو اللہ کی محبت آپ ﷺ کی اتباع میں نصیب ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ محبت کرے گا اور اللہ پھر اس بندے کے گناہ معاف کر دے گا۔

یعنی اطاعت رسول کا یہ کمال ہے کہ اس سے اللہ کی محبت نصیب ہو جاتی ہے اور گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

آدابِ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں "راعنا" کی بجائے "انظرنا" کہنے کا حکم

اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ"[46]

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم "رَاعِنَا" (ہماری رعایت کر) مت کہو اور "اُنْظُرْنَا" (ہماری طرف دیکھ) کہو اور سنو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے"۔

شیخ عبد السلام رستمی اس آیت کے شانِ نزول میں لکھتے ہیں کہ جب صحابہ کرامؓ نبی ﷺ کی مجلس میں ہوتے اور کوئی بات سمجھ نہ آتی تو وہ عرض کرتے "راعنا" (یعنی ہماری رعایت فرمایئے یا ہماری طرف توجہ دیجیے)۔ لیکن یہودیوں نے اپنی لغت کے اعتبار سے اس لفظ کو بگاڑ کر "راعی نا" (ہمارا چرواہا) یا "رعونت" (بے وقوفی) کے معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا تاکہ آپ ﷺ کی توہین کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس لفظ کے استعمال سے روک کر دشمنوں کے وار کو ناکام بنا دیا۔[47]

شیخ رستمی لکھتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو ایک ایسا متبادل لفظ سکھایا جو ہر قسم کے برے معنی سے پاک تھا، یعنی "انظرنا" (ہم پر نظرِ کرم فرمایئے)۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ دین میں ایسے الفاظ اور اصطلاحات سے بچنا ضروری ہے جن سے کسی غلط عقیدے یا توہین کا پہلو نکلتا ہو، خواہ بولنے والے کی نیت اچھی ہی کیوں نہ ہو۔"[48]

شیخ رستمی کے نزدیک یہ آیت ادبِ رسول ﷺ کی اساس ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"صحابہ کی نیت توہین کی نہیں تھی، لیکن چونکہ اس لفظ سے دشمن کو توہین کا موقع ملتا تھا، اس لیے اللہ نے اسے ممنوع قرار دے دیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مقامِ نبوت اتنا بلند ہے کہ وہاں گفتگو میں ذرا سی بے احتیاطی بھی اللہ کو گوارا نہیں۔"[49]

آدابِ مجلسِ نبوی اور دشمنانِ دین کی سازشیں

شیخ رستمی اس مقام پر ایک اہم فقہی قاعدہ بیان کرتے ہیں جسے "سدِّ ذرائع" کہا جاتا ہے (یعنی وہ کام روک دینا جو کسی برائی کا ذریعہ بنے)۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس طرح "راعنا" کہنا بذاتِ خود برا نہیں تھا مگر دشمن کی شرارت کا ذریعہ بن رہا تھا اس لیے منع کر دیا گیا، اسی طرح ہر وہ جائز کام جو کسی بڑی خرابی یا دین کی توہین کا سبب بنے، اسے ترک کر دینا ہی تقویٰ ہے۔[50]

سیرتِ نبوی ﷺ کے مطالعے میں "الفاظ کی حرمت" اور "ادبِ بارگاہِ رسالت" بنیادی اہمیت رکھتے ہیں اس آیت کو صرف ایک تاریخی واقعے کے طور پر نہیں لیا، بلکہ اسے امت کے لیے ایک دائمی ضابطہ قرار دیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کی شان میں ذرہ برابر بھی ایسی بات نہ کی جائے جس سے دشمنوں کو تضحیک کا موقع ملے۔ یہ آیت سیرت کے "ادبی اور تعظیمی" پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے

لیے بہترین دلیل ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام اور مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہو تو اس میں الفاظ کا چناؤ بڑے اہتمام سے، احتیاط سے کیا جائے، ایسا کوئی لفظ جس میں شبہ بھی پیدا ہو اس سے کوئی دوسرا مطلب بھی لیا جا سکتا ہو یا تلفظ کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ ہو سکتی ہو تو اس لفظ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استعمال کرنا انتہائی نامناسب ہے تو اسی سے منع کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ ویسے ہوتا ہے "رَاعِنَا" ہماری طرف رعایت کیجئے، توجہ کیجئے، ذرا ہمارے لئے رعایت فرمایئے۔ لیکن یہودی بڑے بدبخت تھے وہ آتے اور کہتے "رَاعِنَا" (ہمارا چرواہا) اور وہ اور بھی کوئی ایسا لفظ استعمال کرتے جو تھوڑا سا رعونت کے معنی میں آتا ہے اور اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ احمق شخص۔ اور پھر اس وجہ سے کیونکہ وہ ایسا کرتے ہیں، آپ کے پاس آتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارتے اور پھر جا کے خوش ہوتے کہ دیکھو ہم نے یہ کر دیا ہم نے اس طرح ان کو مخاطب کیا تو اللہ رب العزت نے ان الفاظ کو ہی منع کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں بلکہ یہ کہو "اُنْظُرْنَا" ہماری طرف توجہ فرمایئے اور "وَاسْمَعُوْا" توجہ فرمایئے تو مقصد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کا تقاضا یہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام اور مرتبے کا ہم پر یہ حق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خوبصورت الفاظ استعمال کیے جائیں اور کوئی ایسا لفظ جس سے ذرا سا بھی شبہ پیدا ہو اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

خلاصۂ کلام

زیرِ نظر تحقیق میں تفسیر احسن الکلام میں خصائصِ نبوی ﷺ کا تفسیری و تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم نے رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی، اسوۂ حسنہ اور تمام انسانیت کے لیے ہادی و رہبر کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے اور آپ ﷺ کو متعدد ایسے امتیازات عطا فرمائے ہیں جو آپ ﷺ کے مقامِ رسالت کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان خصوصی اوصاف و احکام کو خصائصِ نبوی ﷺ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر احسن الکلام میں ان خصائص کو قرآنِ کریم کی متعلقہ آیات، احادیثِ نبویہ ﷺ اور سیرتی و تفسیری شواہد کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مطالعے سے یہ امر سامنے آتا ہے کہ خصائصِ نبوی ﷺ صرف فضائل و مناقب کا موضوع نہیں بلکہ ان کا تعلق مقامِ رسالت، اطاعت و اتباع، اخلاقِ نبوی، امت کی رہنمائی اور اسلامی تصورِ حیات سے بھی گہرا ہے۔ تفسیر احسن الکلام میں رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ، آپ ﷺ کی خاتمیت، وجوبِ اطاعت، اسوۂ حسنہ اور دیگر امتیازی پہلوؤں کو قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے مفسر کے ہاں مقامِ رسالت کے فہم اور خصائصِ نبوی ﷺ کے بیان میں اعتدال اور روایتی تفسیری منہج کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ خصائصِ نبوی ﷺ کا قرآنی مطالعہ عصرِ حاضر میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت اور منصبِ رسالت کے درست فہم کے لیے نہایت اہم ہے۔ تفسیر احسن الکلام میں اس موضوع کی تشریح قاری کو نہ صرف مقامِ نبوت اور حقوقِ رسول ﷺ سے آگاہ کرتی ہے بلکہ محبت، ادب، اطاعت اور اتباعِ سنت کے عملی تقاضوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ لہٰذا خصائصِ نبوی ﷺ کا مطالعہ علمی و تحقیقی اعتبار سے اہم ہونے کے ساتھ موجودہ دور میں فکری و اخلاقی رہنمائی کا مؤثر ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔

[1]- ʿAbd al-Salām Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām (Peshawar: Dār al-Qurʾān, 2010), 5/1.
[2]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:5–10.
[3]- Al-Qur'an, 52:48.
[4]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 6:234.
[5]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 237.
[6]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 6:339.
[7]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 341.
[8]- Al-Qur'an, 5:67.
[9]- Al-Qur'an, 88:21–22.
[10]- Al-Qur'an, 18:6.
[11]- Al-Qur'an, 34:28.
[12]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 5:128.
[13] - Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 128.
[14]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 131.
[15]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 131.
[16]- Al-Qur'an, 5:3.
[17]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 3:9.
[18]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 3:9.
[19]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 13.
[20]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 13.
[21]- Al-Qur'an, 21:107.
[22]- Al-Qur'an, 34:28.
[23]- Al-Qur'an, 3:164.
[24]- Al-Qur'an, 3:164.
[25]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:431.
[26]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 433.
[27]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 437.
[28]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 437.
[29]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 4:148.
[30]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 149.
[31]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 4:151.
[32]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 4:151.
[33]- Al-Qur'an, 33:6.
[34]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 5:345.
[35]- Muḥammad ibn Ismāʿīl al-Bukhārī, al-Jāmiʿ al-Ṣaḥīḥ, ḥadīth no. 15.
[36]- Al-Qur'an, 33:36.
[37]- Al-Qur'an, 17:79.
[38]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 3:227.
[39]- Al-Qur'an, 73:1–4.
[40]- Al-Qur'an, 17:79.
[41]- Al-Qur'an, 3:31.
[42]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:379.
[43]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 247.
[44]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 247.
[45]- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 317.

46- Al-Qur'an, 2:104.
47- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:78.
48- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:78.
49- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 1:78.
50- Rustamī, Tafsīr Aḥsan al-Kalām, 79.